فلسفہ انسانیت کا استعارہ ٹیگور اور اقبال

دبیر احمد

کولکاتا

دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب کا مطالعہ سیاسی اور سماجی حالات کی تاریخ کے بغیر ناممکن ہے رابندر ناتھ ٹیگور اور اقبال کے دانشورانہ وقار کے متعلق گفتگو کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ان تاریخی حالات وواقعات کا ذکر کیا جائے جن سے مذکورہ دونوں شعراء کے ذہنی رویے اور فکری میلانات کی ہم آہنگی محسوس ہوتی ہے یا جنہوں نے انسانی زندگی تہذیب اور معاشرے کے گونا گو پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو ایک ایسے وقت میں جو ارتقا اور تبدیلی کا نازک دور رہا ہو۔ ۱۸۵۷ء میں آزادی کی پہلی جنگ میں شکست کھانے کے بعد سارا ہندوستان دھیرے دھیرے آخری جنگ کی تیاریوں میں مصروف عمل ہو گیا۔ اس بار پورا ملک عزم واستقلال کے ساتھ انگریزوں سے اپنا وطن واپس لینا چاہتے تھے تاکہ آزاد قوم کی حیثیت سے اپنا سر اونچا کر سکیں ظاہر ہے کہ اس ناسازگار ماحول کو خوش گوار بنانے اور سرخرو ہونے کے لیے نہ صرف شہروں میں بلکہ گاؤں میں بھی جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کی تدابیر پر غور وفکر کرنا تھا۔ دوسری طرف پوری دنیا پر پہلی جنگ عظیم کا خوفناک سایا منڈلا رہا تھا۔ ان نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک ایسے پرسکون راستے کی تلاش تھی جس پر چل کر ہندوستان کا ہر شہری اپنی منزل پر پہنچ سکے تاکہ تھکا ماندہ مسافر کو یک گونہ سکون نصیب ہو اسی زمانے میں ہندوستان کو دو اہم شاعر ٹیگور اور اقبال مل گئے۔ تھکے ہوئے اور ہارے ہوئے یا یوں کہا جائے کہ بے بس ہندوستانیوں کو ایک زندگی عطا کرنے کے لیے۔ دونوں مذکورہ شعراء کی شخصیت نے ہندوستانیوں کی اجتماعی فکر کو مہمیز کیا کیونکہ ٹیگور اور اقبال کا پیغام بالکل ایک جیسا تھا۔ دونوں ساری دنیا میں امن کا پیغام بالواسطہ، اور ہندوستان میں بلا واسطہ دینا چاہتے تھے۔ انسانیت کا درد دونوں میں تھا۔ دونوں اپنے ملک عزیز سے محبت کرتے تھے۔ دونوں کی آنکھیں ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھتی تھیں اہل نظر سے یہ باتیں پوشیدہ نہیں کہ ۱۹۰۴ء میں اقبال نے ایک نظم ''ہمارا دیش'' لکھا۔ اقبال نے اس نظم میں کئی تبدیلیاں کر دیں جو آج بھی ترانۂ ہندی کی شکل میں موجود ہیں یہ نظم ہندوستان کی شان و شوکت اور اس کی عظمت میں لکھی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ رابندر ناتھ ٹیگور کا گیت جسے قومی گیت کہا جاتا ہے اسی نظم کا حصہ ہے۔ دونوں نظموں کو سامنے رکھئے اور دونوں کے مفہوم کو سمجھئے تو آپ پر روشن ہوگا کہ دونوں شعراء کی تخلیق میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ دونوں محبّ وطن ہیں اور دونوں کی فکر اور شعری جہات میں بہت حد تک مماثلت ہے۔ دونوں کی نظموں میں عمیق خیالات اور شدت جذبات کے عناصر ملتے ہیں دونوں اپنے کارناموں کے لیے ہمہ گیر شہرت کے حامل ہیں گرچہ دونوں کی زبانیں مختلف تھیں۔ واقعات وحالات کے تئیں فکر بھی مختلف۔ باوجود اس کے دونوں نے اپنے فلسفیانہ اساس کے تناظر میں انسانیت کے اعلیٰ قدروں کی جس طرح حمایت کی ہے اس کی نظیر خال خال ملا کرتی ہے۔

ٹیگور ویدانت اور بالخصوص ویشنو فلسفہ کے اسیر تھے۔ متعلقات ٹیگور میں مذہبی اثرات یا ویشنو فلسفہ کی بنیادی اہمیت ہے۔ اس طرح بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ویشنو فلسفہ کے اوصاف نے ہی ساری دنیا کو ٹیگور کا دیوانہ بنائے رکھا۔ ویشنو فلسفہ ہندوستانیوں کے مخصوص فکری تناظر میں ایک مخصوص طبقہ کے لیے بلاشبہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن ٹیگور کو پوری دنیا میں جس قدر پذیرائی ملی اور دنیا ان کی جانب متوجہ ہوئی، اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ دیگر خصوصیات بھی ہوں گی جن میں ساری دنیا نے جذبہ وفکر کی تسکین کی صورت گری محسوس کی ہوگی اور اب بھی محسوس کرتی ہے۔ ٹیگور کی شاعری کے مختلف ادوار پر اگر نظر ڈالی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ ویدانت فلسفہ کی کارفرمائی ایسے عناصر کی ہو رہی ہے جو افکار ٹیگور کے پس منظر میں جاری ہے لیکن اس کا پیش منظر بہت سے دیگر عوامل سے مل کر تیار ہوا ہے اس پیش منظر میں خارجی وقوعے تو آتی جاتی لہروں کی طرح شامل ہیں لیکن ان لہروں کے پس پشت ویدانت فلسفہ انسانی اقدار سے ہم آمیز ہو جاتا ہے اور اس کی شاعری ویدانت فلسفے یا ویشنو افکار کی گونج کی بجائے انسان دوستی کی شاعری کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ اگر اردو شاعری کے تناظر سے اس کا تقابل کیا جائے تو اس میں ہم اسے متصوفانہ شاعری کا ایک روپ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ تصوف مذہب کے جامد نظریات اور طریقۂ کار سے بلند ہو کر عشق ومحبت کو اپنا محور بناتا ہے جسے روحانیت، مادی زندگی اور علم وعقل کی لطافتوں کے ارتقاء کا نام دیا جا سکتا ہے۔ وہاں بھی بلاتفریق مذہب وملت انسان دوستی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ٹیگور کی شاعری میں بھی ویدانت اور ویشنو فلسفے کے باوجود ہر مذہب وملت کے لیے الفت ومحبت کا پیغام ملتا ہے۔ یہی خصوصیت ٹیگور کی تحریروں کو آفاقی بناتی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ٹیگور کی عالم گیر قبولیت کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ لفظ ویدانت یا ویشنو یا مذہبی تناظر رکھنے والے کسی دوسرے لفظ کی بجائے بس لفظ محبت یا انسان دوستی ہی ٹھہرے گا۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو ٹیگور کی شاعری کو بلالحاظ مذہب وملت اور ممالک واقوام میں مقبول بناتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے افکار وخیالات میں ایک نوع کا تدریجی ارتقاء ہے۔ ارتقاء کا یہ سفر مذہب سے شروع ہو کر انسان دوستی تک پہنچا ہے۔ ابتدائی دور میں ان کے یہاں مذہب کا غلبہ تھا لیکن بعد کی شاعری میں مذہب تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں ایک پس منظر کا کام کرتا ہے۔ ٹیگور بچپن کے زمانے میں تنہائی کا شکار ہو کر کھڑکی سے فطرت کے مناظر کو دیکھا کرتے تھے۔ ذرا بڑے ہوئے تو والد کے ساتھ ہمالہ کی سیر کو گئے۔ مہینوں کے اس سفر نے ٹیگور کے وجدان کو متاثر کیا اور مناظر فطرت میں آگے چل کر فکر اور فلسفے کی آمیزش ہونے لگی۔ ''صبح کی نظمیں'' اور ''شام کے گیت'' تو ان کے دو ایسے مجموعے ہیں جن میں فطرت کی روح آبسی ہے۔ مناظر فطرت میں فلسفے کی آمیزش بھی ان کی شاعری کی آخری منزل نہیں۔ یہ فلسفیانہ جہتوں سے گزرتے ہوئے انسان دوستی تک جا پہنچتے ہیں۔

ٹیگور اور اقبال فطرت کے حسن اور انسانیت سے خوب محبت کرتے ہیں۔ جس کا اظہار یوں کیا ہے۔

> ''میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں انسانوں سے محبت کی ہے اس تصور نے میرے کشتی حیات کے بادبانوں میں خوشگوار دباؤ کی طرح حدت پیدا کی ہے۔ بادبان نے کبھی ادھر اور کبھی ادھر رخ موڑا ہے تاہم یہ موج کسی تصنیف کی حد بندیوں سے بالا رہا ہے''۔ (پروباشی چیت)

اس سلسلے میں اقبال نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اور جب اقبال کے یہاں حب الوطنی کا جذبہ شدت اختیار کرتا ہے تو وہ خاک وطن کے ہر ذرے کو اپنا دیوتا ماننے کو تیار ہو جاتے ہیں اور بعد میں ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' جیسا قومی ترانہ لکھتے ہیں۔

ٹیگور بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور ساری زندگی شاعر ہی رہے ان کی شاعری میں شدت جذبات کے ساتھ ساتھ موسیقیت کا حسین امتزاج ملتا ہے اقبال ان کے برعکس تھے وہ اپنی شاعری کے زریعہ پیغمبری کا کام کرتے ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر رفیق ذکریا کا اقتباس نقل کیا جا سکتا ہے۔

''ٹیگور نے انسان میں رومان کو دریافت کیا، اقبال نے جاں بازی و جاں نثاری کو۔
ٹیگور نے نسوانی حسن کی تشریح کی، اقبال نے مردانہ شجاعت کی۔ ٹیگور کی شاعری میں
موسیقیت ہے، اقبال کی شاعری میں انسیت۔ ٹیگور ہمیشہ باعمل رہے اور اقبال پرسکون''

ٹیگور اور اقبال زمانے کی سماجی اور سیاسی صورت حال سے متاثر ہوئے گرچہ دونوں نے نئی نسل تک پہنچنے کے مختلف راستے چنے لیکن دونوں شعراء نے اپنی اپنی زبان کے ادب کو مالا مال کیا۔ ٹیگور کی آواز اقبال کے شعری مزاج سے بہت حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ ٹیگور اگر فطرت کے حسن کے شیدا ہیں تو اقبال اس کے اسیر نظر آتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں حب الوطنی کا جذبہ کارفرما ہے تو ٹیگور کے یہاں بھی ان باتوں کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی نظمیں ان کے مجموعہ ''نو ودیا'' میں شامل ہیں۔

اقبال کے یہاں بھی اس فلسفہ کو محسوس کیا جا سکتا ہے بلکہ اقبال حرکت و عمل کو زندگی کا جز بتاتے ہیں بطور نمونہ اشعار پیش کر رہا ہوں۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

ٹیگور اور اقبال فطرت کے حسن اور انسانیت سے خوب محبت کرتے ہیں جس کا اظہار یوں کیا ہے۔

ٹیگور اور اقبال دونوں ایک ہی عہد اور ایک ہی طرح کے مسائل سے نبرد آزما تھے ظاہر ہے کہ ایک دوسرے کے دلوں میں احترام و عزت ہونا لازمی جز ہیں۔ ٹیگور خود اقبال کے ایک دوست عباس علی خاں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں۔

مجھے اس بات سے دلی مسرت ہوئی کہ آپ نے میری اور عظیم شاعر سر محمد اقبال کی شاعری میں گہرا ربط پایا۔ مجھے اس بات سے اکثر کافی تکلیف پہنچی ہے کہ ناقدوں کا ایک گروہ تقابلی اساس پر میری اور سر محمد اقبال کی ادبی خدمات کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ادب کے تئیں یہ ایک غلط رویہ ہے مجھے یقین ہے کہ میں اور سر محمد اقبال دونوں ادب میں صداقت اور حسن کی تلاش پر مامور دوست ہیں اور ایک ایسے مقام پر ہماری ملاقات ہوتی ہے جہاں انسانی ذہن آدم ابدی کے حضور میں اپنے بہترین نذرانے پیش کرتا ہے۔

(عباس علی خاں کے نام ۷، فروری ۱۹۳۳)

ٹیگور کا خیال ہے کہ

اپنی ہی خوشی سے اے خدا تو نے مجھے غیر فانی بنایا ہے میرے فانی جسم کو تم بے شمار مرتبہ مٹا کر ہی اسے نئی زندگی سے سرفراز کرتے ہو۔

تو اقبال ''بالِ جبریل'' میں اسی خیال کو یوں پیش کرتے ہیں

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بے زار ہو اپنی کرن سے

دونوں شعراء کے یہاں فلسفۂ حیات کا جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ٹیگور اور اقبال کے یہاں فکر ایک ہی طرح ہے سوچنے کا انداز بھی ایک ہی طرح ہے۔ ٹیگور اور اقبال کی شخصیت اور نظام فکر کے نشو ونما میں جو قوتیں جذبہ محرک کے طور پر کام کر رہی ہیں ان میں سب سے اہم قوت بنی نوع انسان سے محبت ہے یا انسانوں کے مسائل سے گہری دلچسپی ہے۔ ہر اہم اور معتبر فنکار کی طرح ٹیگور اور اقبال کی فکر اور دردمندی کا مرکز و نظر انسان کی ذات ہی رہی ہے۔ ٹیگور اور اقبال حیات انسانی، اسی کے حال اور مستقبل سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ انسان کی ذات سے یہ تعلق خاطر، وطن اور اس کی آزادی کے بارے میں ان کے رویے پر بھی خوب اثر انداز ہوئے یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو ٹیگور اور اقبال کے بعض معاصرین چکبست، سیماب اور جوش جیسے شعراء کی حب الوطنی اور مسلک آزادی کے درمیان ایک حد فاصل کھینچتے ہیں ہمیں یہاں دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ دونوں شعراء کے بیشتر معاصرین اپنے عہد کی سیاسی قوتوں، نظریوں سے ہی ذہنی غذا، ہمت، جوش اور ولولہ حاصل کرتے رہے جبکہ ٹیگور اور اقبال ان شعراء سے بلند ہو کر اپنے معاصرین کو راہ دکھانے کی کوشش کرتے رہے دراصل ٹیگور اور اقبال کو ایسے محرکات اور مقاصد کی تلاش تھی جو انسان کی عملی قوتوں کو دائمی حرارت بخش سکیں۔ وطن اور اہل وطن سے والہانہ محبت کا وہ جذبہ جو دونوں شعراء کی ابتدائی نظموں میں پوری قوت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے

بالخصوص اقبال کے یہاں وجود آدم سے ان کے تعلق خاطر گری سے پگھل کر جستہ جستہ نئے سانچوں میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔علم وآگہی کے نئے سرچشموں نے حب الوطنی کے جذبے کو نئی منزلوں سے آشنا کیا لیکن یہ بات نشان خاطر رہے کہ اس سفر میں ٹیگور اور اقبال دنیا کے مظلوم اور محکوم انسانوں کی فلاح سے لمحہ بھر کے لیے بھی اوجھل نہیں ہوئے بعض افراد کا خیال ہے کہ اقبال وطن کے تصور سے منکر تھے جو غلط ہے۔وہ عام ہندوستانیوں کی طرح اپنے وطن سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کے دکھ، درد، ان کی صعوبتوں، ان کی غلامی سے دکھی تھے جس کا اظہار انہوں نے اپنے ابتدائی دور کے کلام میں جسے حب الوطنی کی روح کہا جاسکتا ہے ملک کی غلامی کا احساس تھا۔تصویر درد کے یہ اشعار میری بات کی تائید کرتے ہیں۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا اس باغ میں گلچیں!
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

ان اشعار میں دلسوزی، دردمندی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس دولت بیدار سے ہرگز محروم نہیں تھے وہ فرقہ پرست قوتوں کے بڑھتے ہوئے قدم سے دکھی تھے۔وطن سے گہری محبت کا ایک ثبوت وہ خطبہ وصدارت ہے جو ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الہ آباد کے اجلاس میں دیا تھا۔اس خطبہ میں اقبال نے سماجی مفکر کی حیثیت سے اپنے عہد کے ہندوستان کے پیچیدہ مسائل کے پیش نظر جن بنیادی اصولوں کی بات کی تھی اس کی آج بھی اہمیت اسی طرح ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور انسانی تعلقات کے شاعر ہیں۔ان کے اشعار میں لامحدود فضا کا احساس ہوتا ہے۔وہ اپنی روح کی نغمگی کو فطرت اور فضا کے ترنم سے ہم آہنگ کردینے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔یہ فضائی احساس انگریزی کے مشہور شاعر ورڈزورتھ اور اردو کے فراق کے ہاں ملتا ہے۔ٹیگور کے یہاں یہ احساس زیادہ گہرا، رچا ہوا اور معنی خیز ہے ٹیگور اپنے طور پر اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں اور اسے اپنے مزاج میں سمونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ایسا اس لیے ہے کہ ٹیگور کے پیچھے ایک بڑی تہذیب بھی ہے جو ان کے نغموں کی کشش وتوانائی کو مزید قوت بخشتی ہے۔ان کے نغموں میں عمر کی پختگی، بیداری اور آگہی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔دراصل اجتماعی زندگی کے انقلابات احساس کی بنیاد میں بلاشبہ تبدیلی کا موجب بنتے رہتے ہیں جس کے معنی ہیں جذبات کی تہیں، ان کی آوازیں، ان کی موسیقی اور ان کی کیفیت غرض کہ ہر چیز بدلتی رہتی ہے ٹیگور نے اپنے آفاق گیر وجدان کے سہارے اپنی منزلیں آسانی سے طے کرلیں۔یہ دلیل بے

معنی بھی نہیں کہ ٹیگور کے جذباتی ردعمل اوران کے فکری عمل میں ایک نوع کی طرفگی اور پہلوداری ہے جوان کے معاصرین کے یہاں تقریباً مفقود ہے۔

احساس کی شدت ٹیگور کوانسان دوست بناتی ہے۔ یہ احساس اگرچہ ایک فرد کا ہے لیکن معاشرے اورسماج کا زائیدہ اور پروردہ بھی اوراس سے وابستہ بھی۔ ٹیگور کے اس انفرادی احساس میں پورا معاشرہ، بلکہ پوری انسانی تاریخ سمائی ہوئی نظر آتی ہے۔اس تاریخ میں الٰہیات کا تصور بھی ہے اورعبدیت کا زمزمہ بھی۔اس زمزمے میں پوری کائنات اوراس کے جذبات اپنے اپنے طور پر شریک ہوتے رہتے ہیں۔تاہم ان تمام زمزمے میں مقام عبدیت کی شناخت اورعبد ومعبود کے رشتے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔لیکن اس رشتے میں مرکزی جہت انسان ہی کو حاصل ہے۔رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام انسانوں کے قریب نظر آتے ہیں۔عام انسانوں کے مسائل کو سمجھتے ہیں اوراسے اپنی شاعری کا جز بنا کر پیش کرتے ہیں۔

ٹیگور محض شاعر نہیں بلکہ کائنات کے مسائل اوراس کی گتھیوں سے جو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہیں،اس سے بخوبی واقف تھے۔وہ انسانی کیفیات کا عرفان بخشنے کے ساتھ ہی نئی زندگی،نئی قدروں اور نئے شعور کی پرچھائیاں بھی دکھاتے ہیں۔دراصل کائنات ٹیگور کی نگاہ میں ایک سوالیہ نشان ہے۔وہ اس کے غم اورمسرت،اس کے آدرش اوراس کی تاریخ سے آگاہی بھی رکھتے ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ ٹیگور کی انسان دوستی مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔چنانچہ ان کے شعری مجموعہ ''نودیا'' میں یہ شعور مزید پختہ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان انگریزوں کی سیاست کا شکار ہورہا تھا۔سیاسی اتھل پتھل نے شاعر کو پریشان کررکھا تھا ہندوستان کی یہ حالت زار ٹیگور کو آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہے۔

گیتانجلی کے خالق رابندر ناتھ ٹیگور نے زندگی جینا سیکھا تھا۔غریبوں، بےکسوں اور یتیموں پر دست شفقت رکھا تھا۔دنیا میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس نے اپنی زندگی میں پریشانی کا سامنا نہیں کیا ہو۔اگر وہ تخلیق کار ہے اور سچا تخلیق کار ہے تو اس کی تخلیق میں یہ تمام باتیں لاشعوری طور پر در آتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ٹیگور کے یہاں بھی کبھی کبھی ناامیدی،اداسی اورافسردگی کا بسیرا ہوتا ہے۔اس کا اعتراف انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''زندگی میں ایسا وقت بھی آیا جب پے در پہ رنج وغم سے نڈھال ہوکر ایسا محسوس ہوا تھا کہ زندگی کا سب کام پورا ہو چکا ہے،اوراب میں ایک چراغ سحری ہوں۔اب ایشور کا نام جپنے کے دن ہیں لہذا سکون قلب اورابدی امن کی منزل کی تلاش کرنا ہی واحد کام ہے''

غرض کہ ٹیگوراور اقبال کے فلسفہ کوآج لوگ اپنے جلو میں نئے معنی لیے ہوئے لفظوں کواستعمال کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔بعض نقادوں نے ٹیگوراور اقبال پرمختلف قسم کے لیبل چسپاں کرنے کی کوششیں کیں۔ایسا کرتے ہوئے ٹیگوراور اقبال کی شاعری موضوع بحث نہیں بنی بلکہ دونوں کا فلسفہ، پیام،تصوف یا دوسری زبانوں کے شعراء یا ادبا کے ساتھ ان کا تقابلی جائزہ لیا جس سے دونوں کی شعری خوبیوں کو پس پشت ڈال دی گئیں۔میرا خیال ہے کہ ٹیگوراور اقبال کا تعلق مندر کے اس پجاری کی طرح ہرگز نہیں ہے جو اپنے دیوتاؤں پر صبح شام عقیدت کے پھول چڑھاتا ہے۔ٹیگور ہوں یا اقبال دونوں نے تشبیہ کی ندرت اور استعارے کی مدد سے اپنی اپنی شاعری میں ایک کیفیت،موسیقی اور آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔لہذا یہ بات پائے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ٹیگوراور اقبال کی شاعری میں کوئی بھی فلسفہ ہو،معمولی یا غیر معمولی، وہ ہماری محسوسات کا جز بن جاتے ہیں اور یہی وہ محسوسات ہیں جو دونوں کی شاعری کو معراج عطا کرتی ہیں۔